تبصرۂ کتب

علامہ اقبال: شخصیت اور فن، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی۔ ناشر: اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، صفحات ۲۸۲، قیمت۔/۳۲۰ روپے مجلد۔

علامہ اقبال کی شخصیت اور فن پر لکھی جانے والی کتب کو دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ شاید اب اس موضوع پر مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ بقول ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ''علامہ اقبال پر دو ہزار سے متجاوز چھوٹی بڑی کتابوں میں سے ایک سوایسی ضرور ہوں گی، جو کاملاً یا جزواً اقبال کی سوانح اور شخصیت سے بحث کرتی ہیں'' ــــ لیکن جب تحقیقی اعتبار سے ان تالیفات کا تجزیہ کیا جائے تو احساس ہوتا ہے اس موضوع پر مزید اور مستند کام کی ضرورت ابھی پوری نہیں ہوئی۔ چنانچہ اقبال کی سوانح وشخصیت کے حوالے سے ملفوظات، یادداشتوں اور ملاقاتوں پر مشتمل بعض اہم کتب اور جزوی سوانحی تالیفات کے علاوہ ذکرِ اقبال از عبدالمجید سالک (۱۹۵۵ء) سرگذشت اقبال از ڈاکٹر عبدالسلام خورشید (۱۹۷۷ء)، دانائے راز از سید نذیر نیازی (۱۹۷۹ء)، مفکرِ پاکستان از محمد حنیف شاہد (۱۹۸۲ء)، حیاتِ اقبال از ایم ایس ناز (۱۹۷۷ء)، یادِ اقبال از صابر کلوروی (۱۹۷۷ء)، زندہ رود از ڈاکٹر جاوید اقبال (۸۴-۱۹۷۹ء)، محمد اقبال: ایک ادبی سوانح از جگن ناتھ آزاد (۱۹۸۵ء)، جیسی باقاعدہ سوانح عمریاں منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔

علامہ اقبال: شخصیت اور فن ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی تحقیقی کاوشوں کا نچوڑ ہے۔ ہاشمی صاحب ماہرِ اقبالیات ہونے کی حیثیت سے اپنی اقبالیاتی تصانیف کی بنا پر بخوبی نمایاں ہیں۔ ان کی جستجو کے نتائج کی صداقت کا بالعموم اعتراف بھی کیا جاتا رہا ہے۔ خطوطِ اقبال، کتابیاتِ اقبال، تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ اور اقبالیات: تفہیم و تجزیہ جیسی کتاب سے انھوں نے اقبالیاتی ادب میں وقیع اضافہ کیا ہے۔ ہاشمی صاحب کا ابتدائی میلان، خالص تحقیق کی جانب تھا اور وہ زیادہ تر اقبالیات کے ماخذات کی طرف متوجہ رہے؛ لیکن پھر ان کا وقت فکرِ اقبال کے بعض تاریک گوشوں کو منور کرنے میں صرف ہونے لگا، چنانچہ اب انھوں نے تحقیقی وتنقیدی صلاحیتوں کے امتزاج سے اقبال کی ایک مستند سوانح عمری قارئینِ اقبالیات کے لیے پیش کی ہے۔ ان کا یہ ارشاد، ان کے انکسار کا پتا دیتا ہے کہ ''یہ کتاب محققوں

، دانشوروں اور نقادوں کے لیے نہیں؛ اقبال کے عام قاری کے لیے ہے۔ اُس قاری کے لیے، جو اقبال کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا''۔ کتاب کے بالاستیعاب مطالعے کے بعد برملا کہا جا سکتا ہے کہ 'عام قاری' کے لیے تحریر کی گئی اقبال کی یہ سوانح اپنے مندرجات کی سند، محقق کی جستجو اور جہد مسلسل کا احساس دلاتی ہے اور مستقبل کے سوانح نگار کے لیے اسلوب اور معیار کی قابلِ تقلید مثال پیش کرتی ہے، غرض یہ کہ استنادِ واقعات اور اخذ نتائج کے اعتبار سے اس تالیف کو بہت سی علمی کاوشوں پر تفوق حاصل ہے۔

اقبال کی نظم و نثر کو بالعموم الگ الگ اکائیوں کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے، لیکن ڈاکٹر ہاشمی نے ایک جانب، اقبال کے سوانح اور ان کے کلام میں مطابقت تلاش کرنے کی ذمہ داری نبھائی ہے تو دوسری طرف کلامِ اقبال، خطباتِ اقبال اور مکاتیبِ اقبال کو ایک ساتھ پیش نظر رکھ کر حیاتِ اقبال کو زیادہ مستند انداز میں بیان کیا ہے۔

اس کتاب کی ایک خصوصیت جو فوری طور پر قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے، ابواب کے عناوین ہیں۔ اقبال کے اردو فارسی مصرعوں یا اُن کے اجزاء پر مشتمل یہ عناوین بے حد جاذبِ نظر ہیں۔ 'آ بامرے لاتی و مناتی'، 'وہ شمع بارگہِ خاندانِ مرتضوی'، 'سودائے علم'، 'دیدۂ بینائے قوم'، آسودگی نہیں ملتی'، 'شرابِ علم کی لذت......'، 'آخر مل گیا وہ گُل مجھے'، 'اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی'، 'الیکشن، ممبری، کونسل......'، 'حرفِ تہ دارے باندازِ فرنگ'، 'رفتم بہ تماشائے خراباتِ فرنگ'، 'کہ ایں زمیں ز طلسم فرنگ آزاد است'، 'نغمہ در گولے من شکست' اور 'کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست' سے ڈاکٹر ہاشمی کی اپج کا واضح اظہار ہوتا ہے۔

کتاب کو چوبیس ابواب میں تقسیم کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ قاری مختصر وقت میں اقبال کی زندگی کے کسی ایک گوشے سے شناسا ہو جائے اور ہر باب کا اختتام اگلے باب کے مطالعے کی ترغیب دے۔ اکثر ابواب کے آغاز میں تمہیدی نوٹ دیا گیا ہے، جسے اُس باب کے مندرجات کا ملخص کہا جا سکتا ہے۔ پھر ہر باب کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے حیاتِ اقبال کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔ محقق نے نہایت وسیع موضوع کو اختصار و جامعیت کے ساتھ یوں پیش کیا ہے کہ کتاب کے مطالعے کے بعد قاری کو کسی تشنگی کا احساس نہیں رہتا۔

محقق کا یہ کہنا کہ [اس کتاب میں] قارئین کو بعض ایسے واقعات و بیانات بھی ملیں گے، جو سوانح اقبال کی عام کتابوں میں نظر نہیں آتے، کچھ غلط بھی نہیں۔ مثلاً [اقبال کی پہلی بیوی] کریم بی بی اور [بیٹے] آفتاب اقبال کے حوالے سے بعض ایسی تحریریں منظر عام پر آئی ہیں، جن سے اقبال کی ناانصافیوں کا رونا رو دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ہاشمی نے قوی دلائل کے ساتھ ایسے انکشافات کا رَد کیا ہے۔

کیمبرج کے زمانے طالب علمی میں کالج سے باہر اقبال کا زیادہ وقت ڈاکٹر سید علی بلگرامی کے ہاں پُر

لطف مجالس میں گذرتا۔ ڈاکٹر ہاشمی نے ان واقعات کو عطیہ فیضی کے حوالے سے بیان کرنے کے باوجود حاشیے میں یہ صراحت بھی کر دی ہے کہ سید علی بلگرامی کی مجالس اور لندن میں اقبال کے شب و روز، ان کی سرگرمیوں اور مصروفیات کے بارے میں عطیہ بیگم کی یہی کتاب (اقبال) سب سے بڑا ماخذ ہے، اگرچہ عطیہ بیگم کے بیانات کو من و عن قبول نہیں کیا جا سکتا (ص ۷۱)۔ ان کے خیال میں عطیہ بیگم مجلسی ہنگاموں اور تفریحی مشاغل کی دلدادہ تھیں۔ (ص ۹۲) اس سلسلے میں انھوں نے ماہر القادری اور جگن ناتھ آزاد کی بعض تحریروں کی طرف توجہ دلائی ہے۔

صہبا لکھنوی کے خیال میں اقبال نے دوسری بار قیامِ بھوپال کے دوران میں فتنۂ قادیانی پر اپنے مشہور مضامین لکھے (اقبال اور بھوپال، ص ۱۵۴)۔ ڈاکٹر ہاشمی نے اس بیان کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آخری انگریزی مضمون Islam and Ahmadism کے علاوہ قادیانیت پر سب مضامین وہ دوسری بار جانے سے پہلے مئی جون میں لکھ چکے تھے۔ (ص ۲۳۷)

محقق کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس کتاب میں سوانح اقبال کے بعض بیانات و نکات کی تصحیح اور بعض غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد ہندوستان واپسی کی تاریخ مختلف اقبال شناسوں کے ہاں مختلف رہی ہے اور بالعموم یہ لکھ دیا گیا ہے کہ اقبال جولائی کے پہلے ہفتے میں واپس ہندوستان روانہ ہو گئے، لیکن مصنف کتاب نے اقبال اور ان کے وابستگان کی مختلف تحریروں کی مدد سے درست تاریخ کا تعین کر دیا ہے۔ ان کے خیال میں [اقبال کی] لندن سے روانگی اور پیرس آمد: ۸/ جولائی؛ پیرس میں قیام دو روزہ: ۹، ۱۰/ جولائی (ایما ویگے ناسٹ کو ۲۷/ جون ۱۹۰۸ء کے خط میں لکھتے ہیں: چند روز پیرس میں رُکوں گا، جہاں مجھے کچھ کام ہے۔ اقبال یورپ میں، ص ۲۰۱)؛ پیرس سے روانگی: ۱۱/ جولائی (دُرّانی صاحب کے خیال میں پیرس سے بمبئی تک کے سفر میں بحری جہاز میں ۱۱ تا ۱۳ دن لگتے تھے۔ اس لیے) بمبئی آمد: ۲۴/ جولائی کی شب یا ۲۵/ جولائی کی صبح (ص ۹۰)۔

جاوید اقبال کے خیال میں بیرون موچی دروازہ منعقدہ جلسے میں 'جواب شکوہ' پڑھنے کا سنہ ۱۹۱۳ء ہے، لیکن ڈاکٹر ہاشمی کے تحقیقی بیان کے مطابق: اسی زمانے کے مطبوعہ 'جوابِ شکوہ' پر 'نومبر ۱۹۱۲ء' درج ہے؛ دیگر شواہد بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ (ص ۱۱۱)

محقق نے آکسفرڈ یونی ورسٹی کے پروفیسر ایڈورڈ تھامپسن کی پھیلائی ہوئی اس غلط فہمی کا ازالہ بھی کیا ہے، جس میں تھامپسن نے اقبال کے ایک خط سے ایک جملے (پاکستان میرا منصوبہ نہیں ہے) کو سیاق و سباق سے الگ کر کے کہا تھا کہ اقبال پاکستان کے خلاف تھے۔ ڈاکٹر ہاشمی کی رائے میں حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال نے جس منصوبۂ پاکستان سے لاتعلقی ظاہر کی، وہ چودھری رحمت علی کا منصوبہ تھا، جس کی تصدیق

علامہ کے اسی مذکورہ بالا خط سے ہوتی ہے، جس میں وہ کہتے ہیں: اس منصوبے کی پیدائش کیمبرج میں ہوئی تھی۔ اس منصوبے کے خالق یہ سمجھتے ہیں کہ گول میز کانفرنس کے ہم مسلمان نمائندوں نے مسلم قوم کو ہندوؤں یا نام نہاد ہندستانی قومیت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ (علامہ اقبال: چند جہتیں، ص ۱۵۸) ڈاکٹر صاحب کے خیال میں یہ واضح طور پر چودھری رحمت علی کے خیالات اور ان کی سرگرمیوں کی طرف اشارہ ہے۔ (ص ۱۶۰)

اقبال دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن روانہ ہوئے تو بذریعہ خط مفصل سفری حالات لکھ بھیجے، جو ۱۵ر اکتوبر ۱۹۳۱ء کے روز نامہ انقلاب میں شائع ہوئے۔ مدیر نے حوالے کے طور پر صرف یہ لکھا کہ اقبال نے یہ خط اپنے ایک دوست کے نام تحریر کیا تھا۔ ڈاکٹر ہاشمی لکھتے ہیں کہ غلام رسول مہر کی روایت کے مطابق مکتوب الیہ: منشی طاہر الدین ہیں، لیکن اس خط کی جو عکسی نقل گورنمنٹ کالج، لاہور کے مجلّہ تحقیق نامہ (شمارہ: ۵) میں شائع ہوئی ہے، اس کے مطابق مکتوب الیہ: چودھری محمد حسین ہیں۔ (ص ۱۷۱)

علامہ نے بال جبریل کے حصہ دوم کی پہلی غزل کے وضاحتی بیان میں لکھا ہے کہ نومبر ۱۹۳۳ء میں مصنف [شاعر] کو حکیم سنائی غزنویؒ کے مزارِ اقدس کی زیارت نصیب ہوئی۔ ہاشمی صاحب کی تحقیق کے مطابق اقبال نے نومبر میں نہیں، بلکہ ۳۰ر اکتوبر ۱۹۳۳ء کو حکیم سنائی کے مزار کی زیارت کی تھی۔ (ص ۲۰۷)

مولانا حسین احمد مدنی کی جانب سے قومیت کے وطنی تصور پر اقبال نے اعتراضات کیے تھے اور اس سلسلے میں علمی مجادلے کی سی صورت پیدا ہو گئی تھی، لیکن جب حسین احمد نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ میں نے نظریۂ وطنیت کا ذکر بطور امرِ واقعہ کے کیا تھا؛ یہ نہیں کہا کہ 'تم کو ایسا' کرنا چاہیے۔ تو علامہ نے طالوت کو ایک خط میں لکھا کہ مولانا کے اس اعتراف کے بعد مَیں مولانا پر کسی قسم کے اعتراض کا حق نہیں رکھتا۔ اس طرح گویا علامہ اقبال نے وفات سے چوبیس دِن پہلے اس بحث کو ختم کر دیا۔ ڈاکٹر ہاشمی لکھتے ہیں کہ علامہ کی وفات کے بعد مولانا مدنی نے اپنی 'انتہائی عدیم الفرصتی' کے باوجود علامہ کے جواب میں ایک طویل مضمون قلم بند کرنا ضروری سمجھا اور انھیں 'ساحرینِ برطانیہ کے سحر میں مبتلا' قرار دیا۔ یہاں محمد احمد خاں کا ایک بیان بھی درج کیا گیا ہے، جس کے مطابق: یہ بات قابلِ گرفت ہے کہ مولانا نے اس مسئلے کو دوبارہ اُس وقت چھیڑا، جب علامہ اقبال ان کا جواب دینے کے لیے اس دنیا میں موجود نہ تھے اور اس سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ ناشر اور خود مولانا نے اس کتابچے میں علامہ مرحوم پر طنز و تعریض کی۔ (اقبال کا سیاسی کارنامہ، ص ۵۹۹) چناں چہ ڈاکٹر ہاشمی کا یہ کہنا بجا ہے کہ اس صورت میں مولانا کے بعض عقیدت مندوں کی یہ رائے کیسے صائب قرار دی جا سکتی ہے کہ 'حسین احمد' نامی قطعہ ارمغان حجاز میں شامل نہیں ہونا چاہیے تھا۔

محقق نے حیاتِ اقبال سے متعلق بعض مسلّمات پر سوال بھی اٹھائے ہیں، مثلاً اقبال کے تمام سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ میٹرک میں کامیابی کی اطلاع اقبال کو بذریعہ تار ۴/مئی کو ملی۔ سوال یہ ہے کہ [یہ] تار کس نے دیا تھا اور کہاں سے بھیجا تھا؟ (ص ۳۶)

ڈاکٹر ہاشمی بعض مواقع پر غیر شعوری طور پر محمد علی جناح اور علامہ اقبال کی بصیرت کا موازنہ کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ لکھتے ہیں: تاریخ کی ستم ظریفی دیکھیے کہ فروری ۱۹۳۸ء اقبال 'جناح سکندر پیکٹ' کی تنسیخ اور سکندر حیات کے خلاف فوری کارروائی کے خواہش مند تھے، مگر قائداعظم نے اسے بوجوہ مناسب خیال نہیں کیا، لیکن سات برس تک یونینسٹوں کے رویّے کا مشاہدہ کرنے کے بعد بالآخر جناح بھی اسی نتیجے پر پہنچے اور ۱۹۴۴ء میں انھوں نے 'جناح سکندر پیکٹ' کو بے حیثیت قرار دے کہ خضر حیات ٹوانہ کو مسلم لیگ سے خارج کر دیا۔ چناں چہ ڈاکٹر ہاشمی نے اقبال کی سیاسی بصیرت کو قابلِ داد قرار دیا ہے۔ ایک دوسرے مقام پر ڈاکٹر ہاشمی نے لکھا ہے کہ اقبال کے خلوص کے اعتراف کے باوجود جناح نے کئی مواقع پر اقبال کی تجاویز کو نظر انداز کیا۔ قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں؟ ہاشمی صاحب کے خیال میں جناح کی مجبوریاں یہ تھیں کہ ان کے یمین و یسار میں بیشتر 'کھوٹے سکے' تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ مجھے انھی سے کام چلانا ہے۔ (ص ۲۳۷)

بعض مقامات پر، جہاں واقعات کی سند نہیں ملتی، محقق نے اپنے تخیل کی مدد سے اس منظر کو پیش کیا ہے، چناں چہ ایسے میں وہ ایک انشاپرداز کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ اقبال اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ میٹرک کا امتحان دینے گجرات کا سفر کرتے ہیں۔ ہاشمی صاحب ایسے موقع پر تصور کی آنکھ سے دیکھے گئے مناظر پیش کرتے ہیں، لکھتے ہیں: تمام طلبہ بشمول محمد اقبال، مارچ ۱۸۹۳ء کے تیسرے ہفتے گجرات پہنچے۔ بہار کے خوش گوار موسم میں گندم کی لہلہاتی فصلوں کے درمیان ریل کا یہ سفر لڑکوں کو اچھا لگا ہوگا...... امتحان ختم ہوا اور لڑکے دِل و دِماغ کا سارا بوجھ اتار چکے تو واپسی کا سفر ان کے لیے بالکل ایک تفریحی سفر ثابت ہوا۔ دلچسپ اور پُر لطف۔ ہنستے، مسکراتے، گیت گاتے اور ایک دوسرے سے چہلیں کرتے واپس آئے ہوں گے۔ (ص ۳۳) یورپ سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد اقبال کے سیالکوٹ پہنچنے پر ان کے والدین کا کیا رویہ ہوگا، ڈاکٹر ہاشمی کے خیال میں: گھر پہنچتے ہی والدہ نے انھیں لپٹا لیا اور منہ چوما ہوگا۔ (ص ۸۳)

ہمارے یہاں اقبال کے بارے میں متضاد رویے پائے جاتے ہیں، لیکن مصنف کتاب نے کسی مقام پر بھی اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ انھوں نے اقبال کے 'روحانی' مقام و مرتبے کا تعین کرنے یا محض ایک 'عامی' کی حیثیت سے پیش کرنے کے بجائے مختلف روایات کو درایت کی کسوٹی پر پرکھتے ہوئے بیان کیا ہے؛ چناں چہ محقق کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنی اس کتاب میں 'اصل اقبال' کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر ہاشمی نے جہاں تحقیقی معیار پر کوئی سمجھوتا نہیں کیا، وہیں اس بات کا بھی خیال رکھا ہے کہ چونکہ قارئین کی اکثریت کو تحقیقی موشگافیوں اور حوالوں کے انبار سے کوئی سروکار نہیں ہوتا اور یہ کہ وہ مستند اور مصدقہ معلومات سے غرض رکھتے ہیں، چناں چہ ان کے استفاضے کے پیشِ نظر، مجموعی طور پر بیانیہ اندازِ تحریر کو ترجیح دیتے ہوئے ایسے تمام مباحث کو حواشی و تعلیقات میں جگہ دی ہے۔ کتاب اپنے اسلوب کے اعتبار سے ایک علمی شان اور بے ساختگی و شگفتگی کی حامل ہے۔

کتاب کے پیش لفظ سے احساس ہوتا ہے کہ محقق نے اپنی یہ کاوش مرحوم ڈاکٹر صابر کلوروی کے نام معنون کی ہے، لیکن غالباً ناشر کی بعض مجبوریوں کے باعث کتاب اس انتساب کے تحریری اظہار سے محروم رہی ہے تکنیکی اعتبار سے اس کتاب پر مزید محنت کی ضرورت تھی، کیوں کہ کمپوزنگ کی غلطیوں کی عدم موجودگی کے باوجود بعض مقامات پر لفظ ٹوٹ کر دو سطروں میں تقسیم ہو گئے، کئی ایک مقامات پر بین الالفاظ وقفے آ گئے، خط نسخ میں کمپوز حروف بے طرح پھیل کر بد وضع ہو گئے اور حد یہ کہ مختلف ابواب میں سطروں کے درمیان فاصلہ بھی یکساں نہیں رہ سکا۔ اسی طرح باب ۲۱ کے حاشیے ۲۲ پر دی گئی وضاحت بظاہر اسی باب کے حاشیہ ۴۴ کے مندرجات کی طرف اشارہ کرتی ہے؛ غالباً کمپوزر کے تساہل سے یہ عبارت اصل مقام پر کتابت نہیں ہو سکی یا اور کوئی وجہ ہے؟ تکنیکی امور کو خصوصی اہمیت دینے والے مصنف کی کتاب میں اس طرح کی بے احتیاطی کیوں ہے سمجھ نہیں آ سکی۔

تحقیقی اعتبار سے یہ کتاب اپنی پیش رَو سوانحی تالیفات کے مقابلے میں کئی امتیازات کی حامل ہے، اس کے باوجود محقق کا عجز لائق ستائش ہے کہ انھوں نے اسے اقبالیات کے ایک ادنیٰ طالب علم کی ایک معمولی، ناتمام اور ناقص کاوش قرار دیا ہے۔ (ص ۱۲)

اپنے تحقیقی معیار کی وجہ سے یہ تالیف بیک وقت دانشوروں، محققوں، ادیبوں، مؤلفوں، استادوں، طالب علموں، بلکہ عام قارئین کی علمی و ادبی پیاس بجھانے کا سامان رکھتی ہے۔ زیرِ تبصرہ تالیف کی افادیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان نے اس کے علمی مقام و مرتبے اور استناد کے پیش نظر اردو زبان کے ساتھ ساتھ اسے سرائیکی، پشتو، بلوچی، سندھی اور انگریزی تراجم کی صورت میں بھی پیش کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب نہ صرف شائقین اقبال سے داد وصول کرے گی، بلکہ جامعات کے مختلف شعبوں کو بھی اپنی جانب متوجہ کرے گی۔

——— ڈاکٹر خالد ندیم

❁❁❁

علامہ اقبال انسان کی انفرادی و اجتماعی آزادی کے حامی اور غلامی، جبر اور تسلط کے مخالف ہیں۔ اقبال کی شاعری میں اس اجمال کی تفصیل بے شمار پہلوؤں سے سامنے آتی ہے۔ ایک پہلو ''قومی'' یا ''اجتماعی'' سطح پر انسان کے انسان پر ناروا تسلط سے نجات کا ہے۔ اقبال کے زمانے میں بہت سے دوسرے خطوں کی طرح برعظیم میں بھی یہ تسلط تہہ در تہہ صورت میں موجود تھا۔ اقبال جنت نظیر خطۂ کشمیر سے وابستگی (نسلی، روحانی اور ملی) رکھتے تھے۔ انھوں نے اس سرسبز و شاداب خطے کو حکمرانوں کی بوالہوسی کا شکار دیکھا تو دعا گو ہوئے ؎

توڑ اس دستِ جفاکیش کو یا رب جس نے
روحِ آزادیِ کشمیر کو پامال کیا

[کلیات باقیاتِ شعر اقبال،۳۱۴]

افسوس ہے کہ آج ایک سو سال بعد بھی ہم اقبال کی اسی دعا کو دہرانے پر مجبور ہیں۔

کشمیر کے جو باشندے نصف صدی سے بنیادی حقوق کے حصول کے لیے کوشاں ہیں اُن میں ایک معتبر اور معزز نام سید علی گیلانی حفظہ اللہ کا ہے۔ سید علی گیلانی کی پرورش اور پرداخت ایسے ماحول میں ہوئی جو اہل کشمیر کے لیے بے کسی، بے چارگی اور غلامی کا دور تھا۔ وہ شعور و پختگی کی عمر کو پہنچے تو اسلامی انقلاب کے پیغام کی اشاعت اور بھارتی سامراج سے کشمیر کی آزادی کی جدوجہد کو انھوں نے اپنی زندگی کا نصب العین ٹھہرایا۔ ان کے بے باک لہجے کو دبانے کی غرض سے انھیں متعدد بار پس دیوارِ زنداں دھکیل دیا گیا۔ وہ حکومتی سطح پر زبردست دھاندلی کے باوجود ۱۹۷۲ء سے ۱۹۸۹ء کے دوران میں مقبوضہ جموں و کشمیر اسمبلی کے رکن منتخب ہوتے رہے۔ سید علی گیلانی ''جہادِ زندگانی'' میں عزم، جوش، استقامت اور حق گوئی کے ساتھ اور بڑے تسلسل سے حریت کشمیر کا مقدمہ لڑ رہے ہیں، یقیناً یہ ایک کٹھن، صبر آزما اور اعصاب کو شل کر ڈالنے والی جدوجہد ہے۔ اب تک موصوف قلم و قرطاس سے اپنے مضبوط رشتے کا اظہار متعدد تصانیف کی صورت میں کر چکے ہیں۔ وہ چھوٹی بڑی ۴۳ کتب کے مصنف ہیں۔ ایک بہترین مقرر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین مصنف کی حیثیت سے بھی داد پا چکے ہیں۔ حریت کشمیر کی جس جدوجہد سے آپ وابستہ ہیں اس میں ربع صدی سے زاید عرصہ پابند سلاسل رہے۔ اس اسیری کے دوران اپنے اوپر ہونے والے تعذیب و تشدد کو انھوں نے اپنی تصنیف رودادِ قفس میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ سید علی گیلانی بہت اچھے مقرر و مصنف تسلیم

کیے جا چکے ہیں لیکن اب وہ ایک بہت اچھے اقبال شناس کی حیثیت سے بھی سامنے آئے ہیں۔ انھوں نے اقبال کے افکار کی جس عالمانہ اور ماہرانہ انداز میں ترجمانی کی ہے یقیناً یہ اقبالیات میں ایک بہت اچھا اضافہ ہے۔ سید علی گیلانی کو اقبال کے ساتھ جو عقیدت و محبت اور ان کے افکار کے ساتھ جو تعلق اور وابستگی ہے اس کا اظہار اُن کی تحریر اور تقریر میں ہر جگہ پوری آب و تاب کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ اُن کی تقریریں اقبال کے اشعار سے مزین اور تحریریں افکارِ اقبال کی ترجمانی سے لبریز ہوتی ہیں۔ اُن کی یہ دیرینہ خواہش تھی کہ وہ اقبال کی فکر کے حوالے سے باقاعدہ کوئی تحریری یادگار چھوڑیں، سو اُن کی یہ تمنا اور خواہش اقبال ـــــ روح دین کا شناسا کی صورت میں پوری ہوگئی۔ وَ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُوْتِيهِ مَن يَشَاءُ!

سید علی گیلانی کا اقبال سے اولین تعلق ہائی سکول سوپور (کشمیر) میں حصولِ تعلیم کے دوران اقبال کی نظم ''پرندے کی فریاد'' پڑھ کر قائم ہوا۔ یہ نظم اُن کو ازبر ہوگئی۔ اس کے باوجود اقبال کے بارے میں انھیں کچھ معلوم نہ تھا۔ بعد ازاں حصولِ تعلیم کے مراحل کے دوران لاہور میں انھیں بادشاہی مسجد میں تربتِ اقبال کی زیارت سے قلبی سکون اور طمانیت حاصل ہوتا رہا۔ گھنٹوں مزارِ اقبال کا دیدار ہوتا حالانکہ اقبال کے کلام، اُن کے مقام و مرتبے سے وہ بے خبر تھے۔ مصنف نے اس کشش اور وابستگی کو ایک معما قرار دیا ہے۔ وہ اس کی کوئی متعین وجہ بیان کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ بعد ازاں اقبالیات سے آگاہی آقا بیدار بخت کے کالج میں حصولِ تعلیم کے دوران ہوئی ـــــ یہاں سے وہ بنیاد مستحکم تر ہونا شروع ہوئی جو ''پرندے کی فریاد'' نظم یاد کرنے سے استوار ہوئی تھی۔

تحریکِ آزادیِ کشمیر کے رہنما اور کارکنان کا اقبال کی فکر پر اعتماد کا ہونا ایک فطری امر ہے، اقبال اُن بنیادی انسانی اخلاقیات کا درس دیتے ہیں جو نہ صرف مسلم قوم بلکہ دنیا کے ہر انسان کے نزدیک قابلِ احترام ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسّی کی دہائی کو پہنچے ہوئے مجاہدِ آزادی نے اپنی زندگی کے نقوشِ تاباں پر ان موتیوں کو بکھیرنے کا عزم کیا جو اقبال کی شاعری میں جاوید نامہ اور پس چہ باید کرد اے اقوام شرق کے عنوانات نے اپنے اندر محفوظ کر رکھے ہیں۔ مصنف نے یہ کتاب دو اڑھائی ماہ کے قلیل عرصے میں مرتب کر کے مجاہدینِ آزادی کے لیے ایک بہت بڑی اخلاقی کمک فراہم کی ہے۔ مصنفِ کتاب اُن گنے چنے دانشوروں میں شمار ہوتے ہیں جن کو اپنے نقطۂ نظر اور نظریۂ عمل پر کبھی نظرِ ثانی کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ وہ اوّل روز سے جس یقین اور اعتماد کے ساتھ شاملِ کارواں ہوئے تھے اُسی اعتقاد بلکہ اس سے بڑھ کر یقین کی دولت کے ساتھ سالارِ کارواں کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ اُن کی مجاہدانہ مساعی کے خد و خال بہت جامع انداز میں ''اظہارِ تشکر'' کے زیرِ عنوان یوں درج ہیں: ''تحریکِ حریت کے اہداف: اسلام، آزادی اور اتحادِ ملت'' (ص ۱۱) یہ اہداف کیسے حاصل ہو سکتے ہیں؟ سید علی گیلانی بتاتے ہیں:

تحریکِ حریت کے کارواں کا ہر فرد موجودہ دورِ پرآشوب میں روشن چراغ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُن سب کو

سیرت و کردار کی تعمیر میں قرآن وسنت سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے فرداً فرداً بھی اور اجتماعی طور پر بھی جدید جاہلیت کے اندھیروں کو دور کرنے کا چیلنج قبول کر کے مردانہ وار اس جدوجہد میں ہراول دستے کا فریضہ انجام دینا چاہیے۔ اللہ غالب و قاہر اپنی مدد و نصرت سے ضرور نوازے گا۔ (ص ۱۱،۱۲)

کتاب کا تعارف ''چہرہ'' کے عنوان سے معروف کشمیری دانشور ڈاکٹر شفیع شریعتی نے تحریر کیا ہے۔ انھوں نے اقبال کی بلیغ و بُلند فکر اور نوجوان نسل کے لیے اس کی اہمیت واضح کرنے کے لیے جامع انداز میں چند نکات پیش کیے ہیں۔

''اظہارِ تمنا کا سبب'' وہ عنوان ہے جس کے تحت مصنف نے اقبال کے ساتھ اپنی قلبی وابستگی کو مختصر الفاظ میں بیان کر کے بات کا آغاز کیا ہے۔

چھ صفحات [۲۲-۲۸] میں ''پرندے کی فریاد'' کے تحت مصنف نے اقبال سے قائم ہونے والے اپنے اوّلین تعلق اور اس کی افزایش کے مراحل کو بہت مختصر الفاظ میں سمیٹا ہے۔

کتاب کا آغاز ایک توضیحی ابتدائیے ''فکر اقبال کے ترکیبی عناصر'' سے ہوتا ہے جس میں مصنف نے علامہ محمد اقبال کی فکری تشکیل میں کارفرما عناصر کو بہت مربوط انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ فریضہ اقبال کے شعری سرمایے سے اخذ و استفادے کی صورت میں انجام دیا گیا ہے۔ اس تحریر کے اختتام پر مصنف نے اپنے عزم و ارادے کا اظہار بھی فرمایا ہے اور بہت برمحل توجہ کے ساتھ اپنے الفاظ کو یوں درج کیا ہے:

> جس طرح اقبال کو اپنے دور کے حالات نے مایوس نہیں کیا۔ اُسی طرح حالات کی سخت ترین نامساعدت کے باوصف میں بھی مایوس اور نا امید نہیں ہوں۔ لیکن مایوس نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر غفلت کی چادر تان کر بیٹھ جائیں، بلکہ جتنی تاریکی چھا چکی ہے، اسی قدر دیے جلانے کی ضرورت ہے اور رہنمائی کے سرچشموں کی طرف رجوع کر کے اقبال کی طرح سوزِ جگر پیدا کر کے ملت کو جگانے اور بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔ وَمَا ذَالِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيز! (ص ۳۴)

اقبال کا ذکر کسی بھی عنوان سے کیا جائے، ان کے مرشد مولانا روم کا حوالہ بھی آئے گا۔ مصنف نے اشعار اقبال کی روشنی میں فکر اقبال کے تشکیلی عناصر پر مختصر بحث کے بعد ''اسرار انسانیت سے آگاہ پیر رومی'' کا عنوان قائم کیا ہے۔ یہ بیان جاوید نامہ کے بجائے دیگر شعری مآخذ کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے اور اختتام جاوید نامہ کے اس شعر پر ہے:

ہر کہ از تقدیرِ خویش آگاہ نیست
خاکِ اُو با سوزِ جہاں ہمراہ نیست

(جو بندہ اپنی تقدیر سے آگاہ اور باخبر نہیں ہے، اس کا جسم اُس کی روح کے سوز و گداز سے بے خبر رہتا

ہے۔ وہ چلتا پھرتا انسان نظر آتا ہے، مگر اُس میں انسانی روح اور انسانیت کے اوصاف واطوار ناپید ہوتے ہیں)

تذکرۂ رومی کے بعد دراصل کتاب کا آغاز ہوتا ہے جسے ''جہاں دوست کا استفسار'' کا عنوان دیا گیا ہے۔ گذشتہ اوراق میں رومی کے جن روح پرور خیالات کا ذکر ہوا ان کے جواب میں جہاں دوست بھی اپنے قلبی تاثرات کا اظہار کرتا اور رومی سے کچھ سوالات کرتا ہے۔ رومی جہاں دوست کے ان سوالات کے جواب دیتے ہیں، درمیان میں زندہ رود کے بھی کچھ سوالات آ جاتے ہیں جن کو رومی کی فکر سے جواب مرحمت ہوتے ہیں۔ رومی کے ان افکار میں جذبات کی افزونی اور خرد کی نمایندگی نے بہت سے پیچیدہ مسائل پر رہنمائی فرمائی ہے اور امید ہی نہیں یقین کی شمع کو روشن تر انداز میں پیش کیا ہے۔

''صدائے سوز ناک'' کے تحت زندہ رود اور رومی —— نوائے غالب، نوائے طاہرہ اور حلاج کی زبانی علم و معرفت اور عشق و محبت کی حقیقی روح کو اجاگر کیا گیا ہے۔ یہاں جلالِ ربانی اور زیارت نبوی کی ایمان افروز کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اقامتِ دین کا عقدہ بھی زیر بحث آیا ہے۔ مؤلف نے اقبال کے اس شعر کو بنیاد بنا کر بات آگے بڑھائی ہے:

نقشِ حق را در جہاں انداختند
من نمی دانم چساں انداختند؟

(اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کے دین کی کلیت اور عظمت کا نقش دنیا پر ثابت اور غالب کرنے کی بات تو سامنے آ گئی لیکن مجھے معلوم نہیں کہ کیسے اس کو قائم و غالب کیا جائے؟)

اقامت دین کا تصور قرآن حکیم کے کئی مقامات پر بیان ہوا ہے مصنف نے اسے سورۂ شوریٰ کی آیت ۱۳ کی روشنی میں واضح کیا ہے اور اس سوال کا جواب کہ دین کیسے قائم ہو، مختصراً بیان کر دیا ہے۔

''صدائے سوز ناک'' کے بعد ''صحبتِ آدم سے عاجز ابلیس کی فریاد'' کے زیرِ عنوان اقبال نے ابلیس کی زبانی ہمارے شب و روز کی صورتِ حال کی عکاسی کر کے متنبہ کیا ہے کہ ہم ایک طرف تو ابلیس سے نجات کی دعائیں مانگتے ہیں، اور دوسری طرف عملی دنیا اور عملی زندگی اُسی ابلیس کی خواہشات اور منشا و مرضی کی تابع داری میں گزارتے ہیں۔ زندگی کے اس تضاد اور تناقص کو جب تک ہم دور نہیں کریں گے، ہماری موجودہ صورتِ حال میں تبدیلی نہیں آ سکتی ہے۔

''عالم افلاک کا لرزہ خیز سفر'' اور ''قلزم خونیں سے ایک غدار کی فریاد'' کے عنوانات غداری کے بیان پر مشتمل ہیں۔ اس حوالے سے مصنف نے جاوید نامہ کے اشعار کی جو ترجمانی کی ہے وہ اس بات کی غماز ہے کہ مصنف میر جعفر و میر صادق کے کرداروں سے کس قدر آزردۂ خاطر ہیں۔ افسوس بھرے لہجے میں

مصنف کا بیان ہے کہ غداری کا یہ تسلسل کبھی ٹوٹنے نہیں پاتا۔ ایک غدار مر جاتا ہے تو دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ انھوں نے اس تمنا کا اظہار بھی کیا ہے کہ کاش! وقت کا مسلمان اتنا باشعور اور دین شناس ہو کہ وہ ایسے فریب کاروں کو بہ بانگِ دہل کہہ سکے کہ یہ کوئی بھی رنگ اختیار کر لیں میں انھیں پہچان لوں گا۔ مصنف نے اس تأسف کا اظہار بھی کیا ہے کہ علامہ اقبال جعفر اور صادق کی غداریوں پر آتش زیر پا تھے مگر آج ۵۷ مسلمان ملکوں کے عوام ''جعفرانِ ایں زماں'' کے نرغے میں ہیں۔

اس کے بعد مصنف جاوید نامہ سے ذرا صرفِ توجہ کرتے ہوئے پیام مشرق میں غوطہ زنی کرتے ہیں۔ ''شاعرِ مشرق کا شکوۂ شرر بار'' اور ''افغانستان میں اقبال کی آہ و فغاں'' کے عنوانات قائم کر کے کارِ جہاں بانی اور اندازِ حکمرانی کے اُن اسرار و رموز کو کھولنے کی سعی کرتے ہیں جو علامہ نے پیام مشرق کی پہلی نظم ''پیش کش بحضور اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خان'' میں بیان کیے ہیں۔ مثنوی مسافر کے گوہر ہائے آب دار بھی انھی سطور میں چمکتے ہیں۔ ان صفحات میں حکیم الامت نے امت مسلمہ کے حوالے سے جن تاریخی اور زندہ حقائق کی نشاندہی کی ہے مصنف نے اُن کو دور اندیشی اور قائدانہ بصیرت کے ساتھ گوشۂ تاریخ سے نکال کر زمانۂ حال کے اسلامی تناظر کے ساتھ مربوط کر کے بیان کیا ہے۔ مسلم امہ کی اندرونی ناگفتہ بہ صورت حال کو بھی مصنف نے بڑے دردمندانہ انداز میں بیان کر کے امید اور بیداری کی لہر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان سطور میں فرمان شہِ نادر، خطاب بہ اقوام سرحد، پیر روم کا پیغام، کابل میں شاہِ افغان اور اقبال، مغل بادشاہ بابر کے مقبرے پر، غزنی میں مزار حکیم سنائی پر حاضری، حکیم سنائی کی روح کا بہشت سے جواب، فریاد مردِ شوریدہ، اور ظاہر شاہ کے دربار میں —— جیسے ذیلی عنوانات قائم کر کے ہندوستان کی اُس زمانے اور آج کی صورت حال پر سیر حاصل تبصرہ بھی کیا ہے اور رہنمائی بھی فرمائی ہے۔

حکومت و سیاست اور حکمرانی و جہانبانی کے اسرار بیان ہوئے تو مصنف نے ضروری خیال کیا کہ اگر یہاں ایسی شاندار تہذیب کے رنگ و روپ کا تذکرہ کر کے بات کو چھوڑ دیا جائے تو مناسب نہ ہوگا لہٰذا انھوں نے اس صورت حال کی زوال پذیری کے اسباب کو بھی بیان کر دیا۔ عنوان ہے: مسلمانوں کا تنزل اور اس کے اسباب —— تفریق دین و سیاست اور لادین تہذیب کو اس تنزل کا اوّلین سبب قرار دیا گیا ہے۔ چند چیدہ نکات پر مشتمل اس اہم بحث کو مصنف نے مسلم حکمرانوں کے لیے لائحۂ عمل کے طور پر پیش کیا ہے۔ لا الٰہ الّا اللہ کو اس گفتگو میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس بحث کا اختتام والیِ افغانستان ظاہر شاہ کے پیغام کی صورت میں کیا گیا ہے۔ یہ پیغام مسلمان عوام اور مسلمان حکمرانوں کے لیے ہے کہ وہ اسلام کی مبادیات پر اپنے کردار و عمل کی تعمیر کریں تو وہ دنیا میں اپنے گمشدہ مقام کو دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں اور اسلام

دنیا کے لیے وہ حیات قرار پا سکتا ہے جس کی تلاش میں دنیا سرگرداں ہے۔

عالم افلاک کی یہ سیر جاری ہے اور اقبال اپنے پیر و مرشد مولانا روم کی رہنمائی میں جنت الفردوس کی سیر پر ہیں۔ بہت سی آسودۂ خاک ہستیوں کی ارواح سے ملاقات و مکالمہ ہوتا ہے۔ لاہور میں شرف النساء خاتون کا محل دیکھتے ہیں اور قرآن و تلوار کے ساتھ اس کے محکم ترین رشتے اور تعلق کو تحسین کی خراج پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد سید علی ہمدانی اور طاہر غنی کشمیری کی زیارت کا احوال بیان کیا جاتا ہے۔ ان پاکیزہ ارواح سے مکالمے کے دوران جن حقائق کا انکشاف ہوتا ہے ان کے اظہار کا سبب بننے والے زندہ رود (اقبال) کا کردار بھی بہت اہم ہے جو نئے سے نئے طرزِ تکلم اور اندازِ استفسار کے ذریعے حقائق کی گرہ کشائی کراتے ہیں۔

کشمیر کا تذکرہ ہوا تو کشمیر کی درد بھری تاریخ کا ذکر اندوہناک صورت اختیار کر گیا۔ ۱۸۴۶ء سے بات شروع ہوئی، راجا گلاب سنگھ کے ہاتھ، آزادی پسند انگریز نے جموں و کشمیر کے ۷۵ لاکھ مظلوم، بے بس، نہتے اور بے سروسامان انسانوں کو جس قیمت پر بیچا، اس میں ایک آدمی کی قیمت صرف سات روپے بنتی ہے۔ اس کریہہ صورت کے بیان کا آغاز ہو تو بات کیسے ادھوری چھوڑی جا سکتی ہے۔ چنانچہ ۱۸۴۶ء سے شروع ہونے والی داستان ۱۹۳۸ء تک پہنچی اور مزید مختلف منزلوں مرحلوں کو عبور کرتی ہوئی ظلم کے نئے ابواب رقم کرتی چلی گئی۔ کہیں پڑاؤ آ جاتا تو شاید اس مظلوم قوم کو سسکنے کا موقع مل جاتا مگر جبر کے تسلسل نے ایسا نہ ہونے دیا اور معاملہ انگریز کی جمہوریت پسندی سے ہندستان کی مقامی قیادت کو منتقل ہوا تو کشمیر کی سیاہ بختی پر ایسی مہر ثبت ہو گئی جس کے نشانات مدھم پڑنے میں نہیں آ رہے۔

مصنف چونکہ ظلم کی اس تاریک رات کے خلاف کی جانے والی جدوجہد کے سرخیل، سالارِ کارواں اور رحیلِ قافلہ ہیں اس لیے انھوں نے اس موقع پر بجا طور پر حقیقتِ حال کی ترجمانی کا فریضہ انجام دیا ہے۔ اس بحث کو جسے "دردِ ملت کا درماں —— اقبال" کا عنوان دیا گیا ہے، بڑے بلیغ اور پُرتاثیر انداز میں اختتام تک پہنچایا ہے اور ایک درس بھی چھوڑا ہے جو اقبال کے اشعار ہی کی صورت یوں ثبت ہے:

ملتے را ہر کجا غارت گرے است
اصل او از صادقے یا جعفرے است
الاماں از روحِ جعفر الاماں
الاماں از جعفرانِ ایں زماں

(جہاں کوئی ملت تباہ و برباد ہوتی ہے تو اس تباہی کی تہہ میں ہر کوئی صادق اور جعفر جیسا غدار ضرور ہوتا ہے۔ اے میرے اللہ! تو ہمیں جعفر کی روح سے اپنی پناہ میں رکھ، تو ہمیں جعفر جیسے غداروں سے بچا۔)

تاریخ کشمیر کی یہ اندوہناک داستان ختم ہوتی ہے تو ''اقبال بارگاہ الٰہی میں'' کا عنوان قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ بہشت بریں کے سفر میں دیدار الٰہی کا شوقِ فراواں لیے اقبال افکار کے دریا بہائے چلے جاتے ہیں۔ کہیں علم کا ذکر آتا ہے تو کہیں عشق کا، بارگاہ ایزدی میں حاضری کے وقت کی کیفیات، احساسات اور مشاہدات کو زبان ملی تو شاعر کو اپنی عرض داشت پیش کرنے کا موقع بھی میسر آ گیا۔ رب کے حضور رب کی دنیا کی بات شروع ہوئی تو دراز ہوتی گئی۔ جذبات چونکہ تعمیرِ دنیا کے اڈر رہے تھے لہٰذا ناگزیر تھا کہ تخریب کا بھی تجزیہ کیا جائے۔ اس کے عناصر کو متعین کر کے بات آگے بڑھائی جائے۔ یہاں جن چار قوتوں کے منفی کردار کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ علامہ نے ان کو سود خور و والی اور ملا و پیر کے ناموں سے موسوم کیا ہے۔ حکیم الامت نے جس گہرائی میں اتر کر مغربی اور مشرقی دنیا کے ان کرداروں کی نبض شناسی کا کارنامہ انجام دیا ہے یہ انھی کا حصہ ہے۔ مصنف نے بھی اس بحث کو نہ اختصار کی نذر کیا ہے نہ تشنگی سے دوچار ہونے دیا ہے۔ بہت جامع و مانع انداز میں ان چاروں کرداروں پر بھرپور اور جرأت مندانہ اظہار خیال کیا ہے۔ مصنف کا یہ خداداد ملکہ پوری کتاب میں ہر جگہ بخوبی دیکھا جا سکتا ہے کہ جب بھی نیا شعر سامنے آتا ہے اُن کے قلم کی جولانی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ کمال یہ ہے کہ مصنف نے کم و بیش پون صدی قبل معرض وجود میں آنے والی شاعری کو بڑی کامیابی کے ساتھ قومی، ملی، اور بین الاقوامی تناظر سے ہم آہنگ کر کے مسلم امہ کو حالت زار سے نکلنے کی راہ دکھائی ہے۔ مصنف نے جہاں ضروری سمجھا ہے قرآن و حدیث سے بھی رہنمائی پیش کی ہے۔ اس سے دینی مباحث پر مصنف کی گہری اور وسیع نظر کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ یوں یہ حصہ کتاب کے اہم ترین مبحث کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

ابوجہل کے نوحے کو ''چراغ راہ بناؤ، بڑا اندھیرا ہے'' کے زیرِعنوان مختصر طور پر بیان کر کے مسلمان کو متوجہ کیا گیا ہے کہ ہمارے اعمال سے کیا ابوجہل کی آرزو پوری ہوتی ہے یا اطاعتِ رسول کا فریضہ ادا ہوتا ہے؟

اس کے بعد ایک اور اہم مبحث 'خطاب بہ جاوید' کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے جس کو نئی نسل کے لیے مشعل راہ قرار دیا گیا ہے۔ اس بحث میں بھی زوالِ امت کا تذکرہ ہوا جس میں غداری کو بنیادی دخل حاصل ہے۔ کچھ مسلمانوں کی بے عملی کا ذکر ہے۔ کچھ ایمان سے تہی ہونے کا بیان۔ چونکہ خطاب نوجوان سے تھا اس لیے رنگ ناصحانہ اور دردمندانہ ہے۔ جہاں نوجوانوں کو ایمان و یقین اور علم و ہنر کی دولت کے حصول کے لیے آمادہ کیا گیا ہے وہاں بیدار دلی، جہاں بینی اور خودداری و غیرت مندی کا درس بھی دیا گیا ہے۔

آخری عنوان ''اقوامِ مشرق کے لیے نسخۂ کیمیا اثر'' کا آغاز اردو کلام سے منتخب کیے گئے متفرق اشعار سے ہوتا ہے مگر جلد ہی رخ پس چه باید کرد اے اقوام شرق کے اشعار کی طرف مڑ جاتا ہے۔ یہ وہ اشعار ہیں

جو ''خطاب بہ مہر عالم تاب'' کے زیر عنوان فکر اقبال کی ترجمانی کرتے ہیں۔ علامہ مرحوم ان اشعار میں تطہیرِ فکر کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ بعدازاں 'حکمت کلیمی' کے ذیلی عنوان کے تحت نظامِ رسالت کی وضاحت کی گئی ہے۔ صحبت انبیاء کی تاثیر بیان کی گئی ہے۔ 'حکمت کلیمی' کے متضاد و متقابل 'حکمتِ فرعونی' کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس سے مراد وہ حکمت لی گئی ہے جو خالق و مالک، حاکم و رازق اللہ کی حاکمیت کے انکار اور بغاوت پر مبنی ہو۔ جو انسانی ذہن، سوچ اور خواہشاتِ نفسانی کی بنیاد پر تعمیر ہو رہی ہو۔ یہ ذیلی عنوان بھی اپنے اندر بھرپور بلاغت اور جامعیت رکھتا ہے۔ بہت سی ناگفتہ باتیں بڑے سلیقے سے گفتہ بنا دی گئی ہیں۔ اسی تسلسل میں اگلا ذیلی عنوان لا الہ الاّ اللہ ہے۔ چند حروف کے اس کلمے کی جو تشریح و تفسیر کی گئی ہے اسے قرآن مجید کی آیات سے استشہاد فراہم کر کے انتہائی وقیع بنا دیا گیا ہے۔ اسی عنوان کے اندر مسلم امہ کی زبوں حالی کو بیان کرنے کے بعد اس کے لیے نجات کی راہ کا تعین بھی کیا گیا ہے۔ لا الہ الاّ اللہ کے بعد فقر کا ذیلی عنوان مومنانہ اوصاف و کمالات کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ آخر میں مصنف امت مسلمہ کو اپنی زبوں حالی سے نکلنے پر ابھارتے ہیں اور امید کا دیا مؤمن کے ہاتھ میں تھماتے ہیں کہ حق کو بالآخر غالب آ کر رہنا ہے اور باطل کو پسپا ہونا ہے۔ اس مبحث کا اختتام چونکہ کتاب کا بھی اختتام ہے جو بہت بامعنی ہے۔ یہ اُن دو اشعار پر مبنی ہے جو علامہ مرحوم کی آخری رباعی کے اشعار ہیں اور ان میں علامہ نے اپنی زندگی کے اختتام کی طرف اشارہ کیا ہے۔

سید علی گیلانی نے شروع سے آخر تک کتاب کے اندر جہاں ضروری اور مناسب سمجھا قرآن حکیم اور حدیثِ نبویؐ سے بھی رہنمائی لینے کی بھرپور سعی کی ہے جس سے کتاب کی وقعت اور افادیت میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ مصنف نے اقبالیات کے اس سلسلے کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ سے مہلت زندگی مانگی ہے اللہ نے ان کی اس خواہش کو پورا کر دیا اور وہ اگلی کتاب بھی مکمل کر چکے ہیں جو عن قریب منظر عام پر آ جائے گی۔

ڈاکٹر شفیع شریعتی کتاب کے تعارف بعنوان ''چہرہ'' کے تحت لکھتے ہیں:

> سید علی گیلانی فکر اقبال کا آئینہ سامنے رکھ کر مایوسی، شکست خوردگی، مرعوبیت، گروہ بندی، مغرب زدگی، دنیا پرستی، آخرت فراموشی، تن آسانی اور اس طرح کے بے شمار بدنما داغ اور دھبوں سے ملت اسلامیہ اور مردِ مسلمان کو اپنا چہرہ صاف کرنے کی تحریک دے رہے ہیں۔ (ص ۱۶)

ڈاکٹر شریعتی نے کتاب کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر اس امید اور یقین کا بھی اظہار کیا ہے کہ:

> گیلانی صاحب نے اقبال کی فارسی شاعری سے چیدہ چیدہ نظم پاروں کے حسنِ انتخاب اور ترجمے کے ساتھ ساتھ تہذیبی اور تشریحی عبارات میں اپنے احساسات اور جذبات کی عطر بیزی اور رنگ آمیزی کر کے ایک روح پرور، کیف آور، نظر نواز اور انقلاب آفریں سماں پیدا کیا ہے۔ سید علی گیلانی صاحب اقبالیاتی ادب میں اپنا قیمتی حصہ ڈال کر نوخیز نسل کو اقبال مرحوم کی چھوڑی ہوئی فکری میراث کو دامنِ دل میں سمیٹنے کی ترغیب دیتے ہیں:

گر نیابی صحبت مردِ خبیر
از اب و جد آنچہ من دارم بگیر

[جاوید نامہ]

اقبال :روح دین کا شناسا اسلامی تہذیب، تاریخ، ادب، سیاست، مسئلہ کشمیر اور اقبالیات میں دلچسپی رکھنے والے حلقوں کے لیے ایک مفید، معلوماتی اور دلچسپ کتاب ہے۔ مسلمان نوجوانوں کے لیے گیلانی صاحب کی اس کتاب کو ایک گنجینۂ گراں مایہ کی حیثیت حاصل ہے۔ امید ہے کہ کہنہ مشق سیاست دان، انقلابی راہ نما، صاحبِ طرز مصنف، روح دین کے رمز شناس اور اقبال کے شیدائی سید علی گیلانی صاحب کی یہ گراں قدر تصنیف علمی، ادبی اور تحریکی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی حاصل کرے گی۔ ان شاءاللہ! (ص ۱۶، ۱۷)

کتاب کا دیباچہ جسٹس (ر) ڈاکٹر جاوید اقبال نے تحریر کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

علامہ اقبال بھی کشمیری نژاد تھے اور کشمیر سے ایک گہری وابستگی رکھتے تھے۔ وہ غلامی سے کشمیریوں کی نجات کے عمر بھر خواہاں رہے۔ سید علی گیلانی بھی علامہ اقبال کی طرح اسی جذبے اور مشن کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ زیرنظر کتاب ان کی انھی کاوشوں کا ایک حصہ ہے۔ انھوں نے علامہ اقبال کی شخصیت، احیاے ملتِ اسلامیہ کے لیے ان کی کاوشوں اور آزادیِ کشمیر کے لیے اُن کی دیرینہ تمناؤں کو اس کتاب میں باہم دگر مربوط کیا ہے، اور اس بحث میں بڑی حد تک جاوید نامہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فہمِ اقبال میں وہ موجودہ دور کے بہت سے اقبال شناسوں سے کہیں بہتر فکری اور عملی شعور رکھتے ہیں۔

میں ان کو اس فکر انگیز کتاب اقبال: روح دین کا شناسا کی تالیف پر مبارکباد دیتا ہوں اور توقع کرتا ہوں کہ یہ کتاب تفہیم اقبال میں معاون اور مفید ثابت ہوگی۔ نئی نسل، اساتذہ اور دانش ورحضرات کے لیے خصوصاً اس میں ایک بھرپور پیغام ہے۔ (ص ۸)

کتاب دیدہ زیب سرورق کے ساتھ عمدہ کاغذ پر طبع کی گئی ہے۔ تدوینی اعتبار سے بڑی دقت اور مہارت سے کام لیا گیا ہے مگر پھر بھی کمپوز کاری میں کئی فروگذاشتیں رہ گئی ہیں خصوصاً اشعار میں۔ بہر حال مجموعی اعتبار سے کتاب کی پیش کش اس کے شایانِ شان دکھائی دیتی ہے۔

ــــــ حافظ محمد شاہد

❀❀❀